جلد01شمارہ17، 2024

Article

Majeed Amjad's belief in Man, Universe and Allah

مجید امجد کا تصور انسان، کائنات اور خدا

Dr. Zafar Hussain Harral*[1], Dr. Zeab Un Nisa Harral[2], Ayesha Kanwal[3],

[1]Associate Professor Department of Urdu Bahauddin Zakariya University Multan.

[2] Education Department Government of Punjab, Chiniot.

[3] PhD Scholar Department of Urdu Government College University Faisalabad.

*Correspondence: zafarharral@yahoo.com

ڈاکٹر ظفر حسین ہرل[1]، ڈاکٹر زیب النساء ہرل [2]، عائشہ کنول[3]

[1]ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، [2]پنجاب ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، چنیوٹ، [3]پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

Abstract: Majeed Amjad was a prominent Urdu poet of modern era. He studied Arabic and Persian literature in his early age from his maternal grandfather, so the technique of poetry, Arooz, may be .After getting his early education from Jhang, he moved to Lahore for his graduation before independence .That was the time when Nazam was the popular with respect to Ghazal in subcontinent literary circles. So Majeed Amjad preferred Nazam to express his thoughts commonly.In this article I have concluded from the analysis of his poetry that he developed a strong bonding of love for Nature, Man and Allah. Majeed Amjad is a poet of modern Urdu Nazam who achieved a clear connection between Man, Universe and Allah not as the traditionalist believes. This article proves with the examples from his poetry that he believes in Allah and loves Nature and was not a pessimist.

Keywords: Majeed Amjad, Optimism, Love for Nature, Belief in Allah, Urdu Nazam.

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:04-04-2024
Accepted:17-06-2024
Online:27-06-2024

Copyright: © 2023 by the authors. This is an access-open article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

انسان ازل سے اپنی ذات، گردا گرد لا متناہی کائنات اور خالق کائنات کے بارے میں بہت سارے سوالوں میں گھرا ہوا ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان کی حیثیت، بے کنار کائنات سے اس کا رشتہ اور ان کے خالق سے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ انسان یہ بھی سوچتا رہا ہے کہ خالق کون ہے اور وہ کون سی اعلیٰ صفات سے متصف ہے اور اس کائنات کے ساتھ اس کا تعلق کیسا ہے؟ اس بھید بھری دنیا نے ہزاروں سال سے انسان کو تحیّر میں مبتلا کر رکھا ہے۔

دنیا کے مختلف مذاہب نے اپنے انداز میں اس طرح کے بنیادی سوالات کے جواب دینے کی سعی کرتے ہیں، فلسفیوں نے اپنے انداز میں اس مثلث کو حل کرنے کے لیے غور و فکر کیا ہے، سائنس دانوں نے اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں ان اسراروں کے بھید کھولنے کی کوشش کی ہے۔ شعرا اور ادیب اپنے طور پر ان بھیدوں کی دریافت کی کوشش میں لگے رہے۔ کائنات کے بارے میں تجسس اور جستجو کی یہ روایت اتنی طولانی ہے کہ اس کی تفصیل گو دلچسپ ہے مگر بہت مشکل اور سننے میں صبر آزما۔

جھنگ کے رومان پرور اور صوفیا کے مسکن سے تعلق رکھنے والے خطے کے شاعر مجید امجدؔ کے ہاں انسان، کائنات اور خدا کے تعلق کی تعبیرات کی دنیا بڑی بھرپور اور بامعنی ہے۔ وہ بچپن میں اپنی ماں کے ہمراہ اپنے نانا کے گھر آ گئے جہاں ان کی تربیت ان کے ماموں منظور علی فوق اور نانا مولوی نور محمد نے کی۔ ان کے نانا صوفیوں کے چشتی سلسلے سے منسلک تھے جب کہ منظور علی فوق فارسی کے استاد اور شاعر تھے۔ چشتیوں کے اٹل عقائد نے مجید امجد کے مزاج کے بنیادی عناصر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ روایتی صوفی گھرانوں کی اولاد کی طرح مجید امجدؔ نے مدرسے میں عربی، فارسی، فلسفہ، منطق اور طب کے درس لیے اور ساتھ ساتھ وہ سرکاری سکول میں مروج تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔

۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا کیا، ۱۹۳۹ء میں شادی ہوئی اور بد قسمتی سے علیحدگی ہو گئی، اچھی نوکری نہ ملی، معروف معنوں میں زندگی میں کامیابیاں نہ ملیں اور رشتہ داروں نے توجہ نہ دی، ادبی دنیا میں پذیرائی نہ ہے گویا اب زیست قید بامشقت تھی اور ایک رنجور شاعر تھا اور ساہیوال کا سرکاری کوارٹر، جس میں ایک اور سرکاری ملازم کے ساتھ زندگی گزر رہی ہے جو جز وقتی ان کا بھی ملازم ہے۔ تجرد کی زندگی کو ذہن میں لائیں، کھانا پکانا، دھونا دھلانا اور اوڑھنا اوڑھانا سب بے ترتیب اور بے وقت کا ہے۔ گویا خواجہ غلام فرید کے الفاظ میں، 'چس رس نہ مانی گھر دی نہ ور دی'(۱)۔ گورنمنٹ کالج جھنگ سے انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء جب وہ اسلامیہ کالج سے بی اے کرنے کے لیے لاہور آئے تو اس وقت یہاں اقبال و حالی جیسے نظم کے عظیم شعرا کے ساتھ ساتھ فیض اور ن م راشد بھی مقبول تھے۔

غزل اردو شاعری میں بنیادی اور اہم صنف سخن تسلیم کی جاتی ہے اور اس کی روایت بھی بے حد مضبوط ہے۔ لیکن مجید امجدؔ نے غزل کی بجائے نظم کو ذریعہ اظہار بنایا اور یوں لگتا ہے جیسے وہ اقبال اور حالی سے متاثر ہو کر غزل کی بجائے نظم کی طرف راغب ہوئے۔ مجید امجد کے کئی ناقدین نے اس امر کی توسیع کی ہے کہ وہ اقبال اور حالی سے متاثر ہوئے۔ حالی کے ہاں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا اظہار شعری فکر کا بنیادی حوالہ نظر آتا ہے جب کہ اقبال انسان کامل کے تصور کے ساتھ خالق مخلوق اور کائنات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجید امجد نے ان کی تقلید کی بجائے اپنی منفرد فکر کو شعری تجربے کی بنیاد بنایا گو انہوں نے مولانا ظفر علی خان سے لفظیات کی سطح پر اثر بھی قبول کیا۔

مجید امجدؔ کی نظموں میں انسان، کائنات اور تصور خدا کی مختلف جہات بنیادی موضوع کی حیثیت رکھتی ہیں جس کو ان کے ناقدین نے ان کا مذہبی رجحان، زمان و کائنات کا شعور اور مستقبل شناسی وغیرہ کا نام دیا ہے۔ کہا گیا کہ وہ ابتدا میں مذہبی تصور کائنات کے حامی تھے تاہم پختہ عمری میں وہ مذہب کی بجائے سائنس کی جانب زیادہ راغب ہوئے۔ میرے خیال میں وہ اس کائنات کی بے پناہ اور بے کنار وسعت میں انسان کی ہولناک تنہائی اور اس کے نتیجے میں بننے والے تصور کائنات جو بیک وقت مذہبی بھی ہے اور سائنسی بھی ہے، کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ میں اس کو کوشش ہی کہوں گا کہ مطلق سچائی پر آج تک کوئی سائنسدان، شاعر اور مفکر نہیں پہنچ سکا۔ مذاہب کی توجیہات ہمارے دائرہ گفتگو سے باہر ہیں ۔شعرا اور فلسفیوں نے اپنی افتاد طبع اور سائنسدانوں نے اپنے مشاہدات کی روشنی میں مطلق سچائی پر بات کی جو بعض اوقات بہت ساری جگہوں پر آپس میں متماثل ہے۔ آیئے مجید امجدؔ کے کلیات کی پہلی نظم 'حسن' (۱۹۳۵ء) پر نظر ڈالتے ہیں۔ صرف دو شعر دیکھیں۔

ہیں جلوہ خیز زمیں و زماں مرے دم سے ہے نور ریز فضائے جہاں مرے دم سے
ظہور کون و مکاں کا سبب فقط میں ہوں نظام سلسلہ روز و شب فقط میں ہوں (۲)

مجید امجد کے کلیات کی پہلی نظم جو ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی تھی جب وہ ابھی طالب علم ہی تھے۔ انسان، کائنات اور خدا کی اس مثلث میں سب پہلے اور شاعر کے نزدیک اہم ترین رکن وہ خود ہیں اس لیے وہ یہیں سے بات شروع کرتے ہیں۔ ان کا سبب تخلیق کائنات ہونے کا بیان فقط شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ صوفیاء کے اس معروف قول کی بازگشت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا مستور تھا پھر اس نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو اس نے یہ کائنات تخلیق کی۔ واضح رہے کہ یہ یورپ میں Humanism کی تحریک کے نتیجے میں Man centered world کے تصور سے بالکل مختلف بات ہے۔

مجید امجد خالق کائنات سے مکالمہ کرتے ہوئے اس بات پر اسرار کر رہا ہے کہ کائنات، خالق کائنات اور اس کی تخلیق کردہ زمینی و آسمانی جنت کی تخلیق کا سبب صرف انسان ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے۔ اس مثلث کا اگلا مرحلہ انسان اور خدا کا تعلق ہے۔ بہت جلد ہمیں وہ خالق کائنات سے براہ راست مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ معاصر مقتدر طبقے نے خدا کو اپنے جملہ معاملات سے بے دخل کر دیا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں لکھی گئی ان کی نظم خدا (ایک اچھوت ماں کا تصور) کے چند شعر دیکھیں۔

نہیں سمجھے کہ اتنا دور کیوں اس کا بسیرا ہے؟
وہ اونچی ذات والا ہے اور اونچا اس کا ڈیرہ ہے

یہ دنیا والے، یہ امرت کے رس کی چھاگلوں والے
یہ میٹھے بھوجنوں والے، یہ اجلے آنچلوں والے

یہ اس بھگوان کے دامن کو چھو لینے سے ڈرتے ہیں
یہ اس کو اپنے محلوں میں جگہ دینے سے ڈرتے ہیں

کسی نے بھول کر اس کا بھجن گایا، یہ جل اٹھے
کہیں پڑ بھی گیا اس کا حسیں سایا، یہ جل اٹھے

غلط کہتا ہے تو نادن، تو نے اس کو دیکھا ہے
مرے بھولے! ہماری اور اس کی ایک لیکھا ہے (۳)

کیا ہمیں اس نظم میں ایسا طاقتور تصور نظر نہیں آتا جہاں خدا کی ذات سے انسان کا اٹوٹ تعلق استوار ہے۔ خارجی دنیا میں جو معاصر صورت حال خدا کی ذات اور اس سے متعلق مقتدر طبقے کا تعلق ہے اس پر وہ نالاں ہیں اور خدا سے حقیقی تعلق کے خواہاں ہیں۔ مقتدر لوگ جو سمجھتے ہیں کہ دنیا کو درست سمت عطا کرنا ان کی ذمہ داری اور فرض ہے اور وہ ہی اس

بات کے حق دار ہیں کہ لوگ ان کی پیروی کریں اور خدا کا وہ تصور قبول کریں جو ان کو پسند ہے۔ ماں بچے کو بتاتی ہے کہ یہ مقتدر لوگ سچ سے اتنے خوف زدہ ہیں کہ وہ حقیقی تصور خدا کو اپنے دلوں میں جگہ دینے سے خوف زدہ ہیں یوں یہ لوگ نہ صرف سچائی بلکہ انسانیت سے بھی خوف زدہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کائنات میں تخریب و تعمیر کے بھی قائل ہیں لیکن اس کی ابدی حیثیت کو بھی مانتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی ایک نظم 'دوام' دیکھیں۔

کڑکتے زلزے اڈے، فلک کی چھت گری، جلتے نگر ڈولے
قیامت آگئی سورج کی کال ڈھال سے ٹکرا گئی دنیا
ابھی جیسے سحر بستی پہ جیتی دھوپ کی مایا انڈیلے گی
گلی جاگے گی، آنگن، ہمسائیں گے،
کوئی نیندوں لدی پلکوں کے سنگ اٹھ کر
کہے گا۔۔۔' رات کتنی تیز تھی آندھی'(۴)

یہ تصور کائنات (World View) بیک وقت سائنسی بھی ہے اور مذہبی بھی۔ یعنی کائنات کی تباہی یا دوسرے لفظوں میں کہہ لیں کہ قیامت کے بعد بھی زندگی قائم اور دائم رہے گی اور قیامت کے بعد نئی طرح کی زندگی کی تخلیق ہو گی۔ یہ تصور کائنات عین مذہبی ہے۔ اس نکتے کی طرف مجید امجد کے اور ناقدین نے بھی اشارے کیے ہیں۔ خدا کی ذات پر ان کا یقیں محکم ہمیں ان کی تمام تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ اس بے پایاں یقین کے باوجود وہ مسلسل خالق کائنات کی اس تخلیق جس کو ہم کائنات اصغر یعنی انسان اور کائنات اکبر یعنی ماورائے انسان، کے نام سے جانتے ہیں کے پوشیدہ اسراروں کی سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ نظم 'دنیا' (۱۹۴۰ء) کے چند اشعار دیکھیں۔

جہاں کی حقیقت کی کس کو خبر ہے — فریب نظر تھی، فریب نظر ہے
یہی پھول کی زیست کا ماحصل ہے — کہ اس کا تبسم ہی اس کی اجل ہے
یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ خبر کیا! خبر کیا! — مرے تیرہ ادراک کی ہو سحر کیا
مری بزم دل میں نہیں روشنی کیوں؟ — ہے بے صید میری نگہ کی انی کیوں؟(۵)

شاعر کی جستجو علم اس کو بے چین کر رہی ہے وہ حقیقت کا متلاشی ہے، آپ اسے تنقیدی اصطلاح میں تلاش ذات بھی کہہ سکتے ہیں۔ در حقیقت انسان، کائنات اور خدا کے تعلق کے اسرار کو سمجھنے کی شدید خواہش ہی اس کو مختلف سمتوں

میں سفر پر مجبور کر رہی ہے۔ کبھی وہ معروض کو مابعد الطبیعیات سے ملاتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک طرح کا پل تعمیر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی سائنسی مشاہدات کو مذہبی فرمودات کی روشنی میں پرکھتا ہے۔

ان کی بڑی معروف نظم' کنواں '(۱۹۴۱ء) ہے۔ جہاں وہ اس خوبصورت میکانکی حرفت کو علامت بناتے ہوئے کائنات کے خالق سے انسانی رشتوں کے اسراروں کے بھید کھولتے ہیں۔ کنوئیں والا گادی پہ بیٹھا چین کی بانسری بجا رہا ہے اور کائنات اس کی بانسری کی مدھر دھن سے مست ہو کر خود کار نظام کے ذریعے چل رہی ہے ۔ لیکن یہ Automationاس طرح کی نہیں جہاں تخلیق کار کا وجود اب ضروری نہیں رہا بلکہ ایسا سرمدی نغمہ کائنات کو رقصاں کیے ہوئے ہیں جس کا منبع اس کی ذات ہے ۔ کنوئیں کو چلانے والا اور اس کی بانسری کی دھن ناگزیر ہے۔ ہم بانسری ، مدھر دھن اور نغمہ سرمدی جیسی علامت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ نظم 'کنواں' کا کچھ حصہ دیکھیں۔

کنوئیں والا، گادی پہ لیٹا ہے مست اپنی بنسی کی میٹھی سریلی صدا میں
کہیں کھیت سوکھا پڑا رہ گیا اور نہ اس تک کبھی آئی پانی کی باری
کہیں بہہ گئی ایک ہی تند ریلے کی فیاض لہروں میں کیاری کی کیاری
کہیں ہو گئیں دھول میں دھول لاکھوں، رنگا رنگ فصلیں، ثمر دار ساری

پریشاں پریشاں
گریزاں گریزاں
تڑپتی ہیں خوشبوئیں دام ہوا میں
نظام فنا میں
اور اک نغمہ سرمدی کان میں آ رہا ہے، مسلسل کنواں چل رہا ہے(۶)

انسانی مقدر کی ہولناک تنہائی، وسیع اور بے کنار کائنات میں اس کا انتہائی ننھا وجود، وقت کے بے انتہا طویل سفر میں اس کی چند ساعتوں کی زندگی اس کو بے قرار کیے ہوئے ہے۔ لا محالہ اس کا خالق کائنات کی طرف متوجہ ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے، میرے خیال میں اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں، مجید امجدؔ کا صوفیانہ پس منظر اور ان کا وسیع مطالعہ بہت جلد ان پر یہ راہیں روشن کر دیتا ہے اور وہ انسان، کائنات اور خدا کی مثلث کی تفہیم کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ ان کی بہت ساری نظمیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں لکھی گئی ان کی نظم 'محبوب خدا سے' کے چنیدہ اشعار دیکھیں۔

نو بہار گلستان معرفت　　یعنی اے روح وروان معرفت
اہتمام واہتنراز کائنات　　تیری اک ادنی نگاہ التفات
اک فقط درد آشنا تو ہی تو ہے　　میرے دل کا مدعا تو ہی تو ہے
زندگی کی زندگی تو ہی تو ہے　　روح کی تابندگی تو ہی تو ہے
میرے دل کو مہبط انوار کر　　مجھ کو بھی بینندۂ اسرار کر(۷)

۱۹۵۸ء میں 'شب رفتہ' کے نام سے پہلا شعری مجموعہ اور واحد شعری مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہوتا ہے ۔ساہیوال کے مختلف ہوٹلوں پر دفتر سے فارغ وقت گزارتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح حاکم وقت جو چار آنکھیں رکھنے کے دعویدار ہوتا ہے، سامنے کا بھی نہیں دیکھ پاتااوران کی شاعری کو سماج دشمن سمجھ کر گردن زدنی قرار دیتے ہوئے ان پر رزق کے وسائل تنگ کر دیے جاتے ہیں۔ سارا کچھ تو سامنے کا ہے کیاان کی زندگی مایوسی کی زندگی ہے ، وہ قنوطیت کا شکار ہیں یا سید عبداللہ کے بقول زندگی کی ہولناک سنجیدگیوں سے واقف ہونے کے باوجود مطمئن اور پر وقار زندگی بسر کرتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں کوئی دوسری راہ نہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر ان جیسی زندگی گزارنے والے لوگ اپنے آپ کو مکمل طور پر مذہب کے حوالے کر دیتے ہیں اور بے عمل ہو جاتے ہیں یا اس کے بالکل برعکس نظر آتے ہیں لیکن ہمیں کوئی ایسا سانحہ مجید امجد کی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ پھر وہ کیسا شخص تھا جس کے پاس ہجرت جیسا کوئی مقبول عام ٹریجک موضوع نہیں ہے، جو تصوف کے مضامین سے اپنے شعروں کو نہیں سنوارتااور جو اپنے رومانوی بیانات سے اعصاب کو برانگیختہ نہیں کرتا لیکن پھر بھی ایک زمانے کو اپنا اسیر کیے ہوئے ہے۔

میرے پاس ایک ہی راستہ بچتا ہے کہ میں مجید امجد کو مزید سمجھنے کے لیے متن، مصنف اور قاری کی تثلیث میں سے متن کو منتخب کرتے ہوئے مصنف کی طرف سفر کروں۔ میرے لیے مجید امجد کون ہے ؟میرے لیے مجید امجد وہ ہے جو مستقبل کے خواب دیکھتا ہے جو ایسا مستقبل تعمیر کرنے کا خواہش مند ہے جہاں زمین زاد اپنی مرضی سے زندگی گزار سکے۔ میرے لیے مجید امجد وہ ہے جو وطن کی محبت میں نظم ''ڈر کا ہے کا'' (۱۹۶۸ء) لکھتا ہے۔

یوں بھی نہ مقصد حاصل ہو تو پھر کیا
دیکھو تمھارے گھٹیلے جثے میں ذہن کی جتنی طاقت، اس کو کام میں لاؤ
اس اک حرف کو دیکھو، شکل ہے جس کی اک زنجیر کی صورت

بھرے کٹہرے میں تم میز پہ مکہ مار کے کہہ دو
یہ اک حرف تو اس پستک میں نہیں کہیں بھی.....
پستک جس کے سب حرف اور سب سطریں سیدھی سیدھی ہیں''
تم دیکھو گے، ترازو کا وہ پلڑا جس میں تم ہو، تمھاری جانب جھک جائے گا
رہ گئی اک یہ مقدس مٹی..... ہمیں تو ہیں اس کے ریزہ چیں
ہم اس کی خاطر جی لیں گے، ہم اس کی خاطر مر لیں گے (۸)

کلیات مجید امجد کے چوتھے حصے 'فردا' میں شامل دوسری نظموں پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہاں مجھے وہ مجید امجد نظر آتے ہیں جنہیں اس بات کا دکھ ہے کہ حکومت اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کرنے سے قاصر ہے۔ قاتل اور مجرم سزا پانے کی بجائے کھلے عام گھوم رہے ہیں اور دولت سے مردم گزیدہ کا مونہہ بند کر دیا جاتا ہے۔ دکھیاری ماں کے پاس چند روپے معاوضہ کے طور پر وصول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ نظم 'ایکسیڈنٹ' (۱۹۶۸ء) سے یہ سطور دیکھیں۔

کالی بجری کے روغن میں جینے والے اس معصوم لہو کی کون سنے گا؟
ممتا بھی بک چکی ہے چند ٹکوں میں
قانون آنکھیں میچے ہوئے ہے
قاتل پہیے بے پہرہ ہیں۔ (۹)

ایسا لگتا ہے ساٹھ کی دہائی میں لکھی اس نظم میں شاعر مستقبل کی ہولناک صورت کا عکس دیکھ رہا ہے۔ آج وطن عزیز میں حادثات اور سماوی آفات پر معاوضوں اور امداد کی بندر بانٹ کی معاصر صورت حال اس بات کی گواہ ہے۔

شاعر اپنے روزمرہ کے تجربات و قلبی واردات کو فن کی تخلیق میں برتتا ہے۔ وہ ہمیں ماضی اور حال کے حالات سے آگاہ کرواتا ہے اور ان پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ اپنی خوشیوں میں شامل کرتا ہے اور مشکل لمحات کے اخفا سے ہمیں دکھی کرتا ہے۔ اس کے باوجود نئی دنیا کی تعمیر کا خواہشمند بھی ہوتا ہے۔ ایسی دنیا کی تخلیق کی خواہش جو اس کے ورلڈ ویو (world view) کے مطابق ہو۔ ۱۹۷۳ء میں لکھی گئی ایک غزل جس میں وہ ایک خواب کی خوش کن تعبیر کے خواہش مند ہیں۔

اور اسی دور کی ایک نظم جس میں ملک اور ملک باسیوں سے ان کی محبت ایسے دور کے خواب دکھا رہی ہے جو ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے۔ نظم 'میرے سفر میں۔۔۔' (۱۹۷۳ء) کی چند سطور بھی قابل توجہ ہیں۔

اور میرا دل مجھ سے پوچھتا ہے
جانے ہم اپنی روحوں میں کب اس سورج کو
ابھرا ہوا دیکھیں گے
وہ سورج جو اب تک کبھی نہیں ڈوبا۔(10)

ہمیشہ روشنیاں اور خوشیاں بانٹنے والا سورج طلوح کب ہو گا؟ جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ ان کو یہ معلوم ہے کہ ایسا ہونا ناممکن تو نہیں ہے لیکن مشکل ضرور ہے کہ اس دنیا کے مقتدر یہ نہیں چاہتے کہ سورج سب انسانوں کے لیے مثاوی فیض رساں ہو۔ اس زخمی سماج کے ریاکار خود ساختہ خیر خواہ جو اپنے تئیں دنیا کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں، جن کا خیال ہے کہ اگر وہ یہ سماجی خدمت سرانجام نہ دیں گے تو دنیا کا قائم رہنا ممکن نہیں۔ مجید امجد ان کے اصل کردار سے واقف ہیں۔ کتنا یقین ہے اس کی بات میں کتنا تلخ سچ ہے اس کے پاس کہ خیر کے داعی یہ ریاکار اور ظالم سماج سیوک ماضی کے ان حکمرانوں سے بھی زیادہ ظالم ہیں جو سچ کے متلاشیوں کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیتے تھے۔ اس طرح یہ سماج سیوک دلوں میں کالے ارادے چھپائے خیر کی منزلوں کو برباد کر دیتے ہیں، صرف دولت کے لالچ میں جو روحوں کو مردہ کر دیتی ہے۔ نظم 'کہنے کو تو۔۔۔' (۱۹۷۱ء)

لیکن، تم نے دیکھا، جب بھی چکنا چور ضمیروں والے سماجوں میں
کوئی خیر کی منزل سامنے آتی ہے
تم نے دیکھا، کیسی کیسی اپاہج نیکیاں اپنے بجتے جبڑوں کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں
دیکھنے میں تو اتنے سیدھے صراطوں پر چلنے والی۔۔۔۔۔
اور جب ان کی آنکھوں کے رستے ان کے دلوں میں گزر کر دیکھو، تو
اندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
اندر۔۔۔۔۔۔ گھات لگائے، ان کے ضمیروں میں مضمر ہیں وہ سب تیز نگاہوں والے
کالے ارادے، جو موقع پا کر

خیر کی ہر منزل پر جھپٹتے ہیں
روحوں میں جم جانے والے سیسے کی خاطر۔۔(۱۱)

وہ کبھی بھی مایوس نہ تھا، کتنا یقین ہے اس کو اپنی فیض رسانی پر، کتنا تیقن ہے اس کے لہجے میں، کتنا وقار ہے اس کی دعا میں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کو وہ سب نصیب ہو گیا تھا جس کی طلب چالیس سال پہلے اس نے اپنی نظم 'محبوب خدا سے' میں ۱۹۳۴ء میں کی تھی۔ وہ جان چکا کہ میسر وقت ختم ہونے کو ہے۔ تب وہ حساب زندگی ہمارے سامنے رکھ رہا ہے اور خود ایک نگاہ ماضی پر ڈالتا ہے، اپنا احتساب نہیں کرتا بلکہ فخریہ دیکھتا ہے وہ سرخوشی کے عالم میں ہے تب ہی وہ حساب زندگی سامنے رکھنے کی جرأت کرتا ہے۔ کلیات میں آخری نظم (۱۹۷۳ء) 'یہ دن' یہ تیرے شگفتہ دنوں کا آخری دن' اس کی عمدہ مثال ہے۔

شاعر کی زندگی کی کہانی انتہائی مختصر ہے۔ جھنگ میں پیدا ہونے اور اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں لاہور سے اپنی تعلیم مکمل کی ہے اب عملی زندگی کی کٹھن راہ سامنے ہے۔ قسمت نے شاعری کا ملکہ ودیعت کر دیا ہے، معاصر ادبی فضا پر انجمن پنجاب، علامہ اقبال اور برصغیر کے سیاسی حالات کی بنا پر اردو ادب کی معروف روایتی صنف سخن غزل کی بجائے اردو نظم چھائی ہوئی ہے۔ یوں مجید امجد کی منزل مقصود بھی نظم بن جاتی ہے۔ اپنی شاہراہ زندگی کی واضح سمت متعین کرنے کے بعد شاعر نبی پاک حضرت محمدؐ سے مدد کی التجا کرتا ہوا محولہ بالا نظم ''محبوب خدا سے'' (۱۹۳۴ء) لکھتا ہے۔ ان کی زندگی کے آخری دنوں کی نظم جس کے بعد کلیات میں باقاعدہ کوئی اور نظم شامل نہیں' یہ دن، یہ تیرے شگفتہ دنوں کا آخری دن' (۱۹۷۳ء) قابل غور ہے، دونوں نظموں کے سن تحریر خاص طور پر قابل توجہ ہیں، لیکن ان کو ملا کر پڑھا جا رہا ہے۔ دوسری نظم میں کل سترہ شعر، سولہ جمع ایک، دنیاوی زندگی میں رس کے معروف سولہ سنگار، اور ایک شعر آخرت کے لیے دعا۔ سولہ شعر، جو کچھ اس کو ودیعت کیا گیا اس کی تقسیم میں کہیں کوتاہی تو نہیں ہوئی، نہیں زمانہ گواہ ہے اور خود اس کو بھی اب یقین ہے کہ وہ فیض رساں، بزم ہم نفساں کا ساتھی، کرم کرنے والا، متبسم، دلوں کو روشنی اور زندگی دینے والا، حلیم اور آبرو والا، یکتا نصیب والا اور گہر افشاں تھا، اس نے رس کی تقسیم میں فیاضی دکھائی ہے۔ یہ مقام اطمینان صرف اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو یہ جانتا ہو کہ اپنے شعور کے اولین لمحوں میں کی گئی التجا میں مانگے ہوئے سب کچھ کو پا چکا ہے۔ وہ زمانوں سے گہر افشاں گزر آیا ہے، کیا اس کے تصور انسان، کائنات اور خدا پر مزید کچھ کہا جا سکتا ہے؟ اسی نظم کے سترھویں اور آخری شعر میں دعا کر رہا ہے۔

ترے لیے جھکے مینائے کوثر و تسنیم　　　　ترے لیے کھلیں درہائے روضہ رضواں

حوالہ جات:

۱۔ فرید ،خواجہ ،''آکھ غلام فرید''،مرتب علمدار حسین بخاری، سرائیکی ایریا سٹڈی سنٹر، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان،۲۰۲۰ء: ص۳۲۰

۲۔امجد، مجید،''کلیات مجید امجد''مدون۔ زکریا، خواجہ محمد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء: ص۳۷

۳۔امجد، مجید،''۲۰۱۴ء: ص۵۰

۴۔ایضاً: ص۳۷۲

۵۔ایضاً: ص۵۶

۶۔ایضاً: ص۵۹

۷۔ایضاً: ص۱۸۵

۸۔ایضاً: ص۴۷۲

۹۔ایضاً: ص۴۶۹

۱۰۔ایضاً: ص۶۰۶

۱۱۔ایضاً: ص۶۱۰